کسی امارت پر فائز ہونے پر بہت گہرے تقاضے ہیں انہیں لازماً پورا کرنا ہوگا۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 14 / جون 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور انور نے فرمایا:

گزشتہ خطبات میں جرمنی کے سفر کے دوران بھی اور بعد ازاں بھی میں نے جماعت کو امارت کی عزت اور احترام کی طرف توجہ دلائی اور جماعت کو نصیحت کی کہ اپنی اطاعت میں محبت اور خلوص کا رنگ پیدا کریں کیونکہ یہی سچی اور حقیقی اطاعت ہے جو انسان کو ابتلاؤں سے بچاتی ہے۔ اگر محض میکانیکی یعنی مکینیکل اطاعت ہو تو ایسی اطاعت بعض دفعہ ٹھوکر کے مقام پر انسان کو سہارا نہیں دے سکتی اور معمولی عذر پر بھی انسان اپنی اطاعت کا تعلق توڑ کر خود سری کی طرف مائل ہو جاتا ہے یعنی جہاں محبت اور ادب کے رشتے ہوں وہاں یہ دونوں رشتے اطاعت کی حفاظت کرتے ہیں اور ان کے اندر ایک وارفتگی سی پیدا کر دیتے ہیں، ایک ایسا رجحان جس کے بعد انسان اطاعت کی سختیوں کو برداشت کرنے کا اہل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماں کو جو تربیت میں مرتبہ اور مقام حاصل ہے اتنا کسی اور رشتے کو نہیں کیونکہ ماں کی سختیاں بسا اوقات ردعمل کے بغیر بچہ جھیلتا ہے اور جہاں ردعمل دکھاتا ہے وہاں ماں کا کوئی قصور ہوا کرتا ہے۔ وہ ماں جو فطری تقاضے پورے کرتی ہے، بچوں سے پیار اور محبت کے تعلق قائم رکھتے ہوئے ان کی اصلاح کا خیال رکھتی ہے اس ماں کے بچے سختی کے وقت بھی دکھ تو محسوس کریں گے، بغاوت نہیں کریں گے۔

پس جہاں جماعت کو میں نے توجہ دلائی ہے وہاں اب میں امراء کو بھی نصیحت کرنا چاہتا ہوں بلکہ ہر جماعتی عہدیدار کو کہ اس نے اگر خدمت لینی ہے اور اطاعت کے اعلیٰ نمونے دیکھنے ہیں تو

خود اس کے لئے لازم ہے کہ اول وہ اطاعت کا اعلیٰ نمونہ بنے۔ یعنی اپنے سے بالا، اس پر نظر رہے اور وہ بہترین اطاعت کا ایک نمونہ بن جائے اور دوسرے جس طرح آنحضرت ﷺ کے لئے اطاعت کا حکم ہے آپ کے لئے اگر ہے تو اس کے تابع ہی ہے مگر اس کے ہم مرتبہ نہیں ہوسکتا۔ گو منطقی نقطہ نگاہ سے ہم کہہ دیتے ہیں کہ چونکہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت میں آپ کے مقرر کردہ امراء کی اور غلاموں کی اطاعت بھی داخل فرما دی گئی ہے اس لئے ان سب امراء کو جو نظام جماعت کے نمائندہ ہیں یا صدر ہیں یا قائدین ہیں یا زعماء ہیں یا لجنہ کی صدرات ہیں ان سب کو اطاعت کا اپنے منصب کے لحاظ سے ایک حق حاصل ہو گیا ہے اور اس میں ان کی ذات کا کوئی دخل نہیں۔ یہ نصیحت جہاں میں کر رہا ہوں وہاں یہ بھی سمجھانا چاہتا ہوں کہ باوجود اس کے کہ سب سے زیادہ اہم ترین اطاعت کا حکم حضرت محمد ﷺ ہی کے لئے ہے اور آپؐ ہی کی ذات کے حوالے سے پھر آگے یہ حکم پھیلا ہے۔ مگر آپؐ کے متعلق بھی قرآن کریم نے متنبہ فرمایا کہ اگر تجھے وہ رحمت کا دل نہ دیتے جو ہر وقت ان پر جھکا رہتا ہے، ہر وقت ان کے خیال میں مگن رہتا ہے، ان کی تکلیف تجھ پر مصیبت بن جاتی ہے عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ (التوبہ:128) جو دکھ اٹھاتے ہیں تجھے بھی مصیبت پڑ جاتی ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا اس قسم کی کیفیات تو تیری اعلیٰ عظمت اور تیرے متعلق خدا تعالیٰ کے اعلیٰ فرمان بھی ان کو اکٹھے نہ رکھ سکتے اس لئے کہ تو تو صحت مند ہے یہ سارے صحت مند نہیں اور جو اعلیٰ صحت اطاعت کے لئے درکار ہے جو ہر ٹھوکر سے بالا ہو جاتی ہے، ہر ابتلاء سے ثابت قدم گزرتی ہے وہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی اور وہ صحابہ اکرام جو آنحضرت ﷺ کی صحبت میں قریب تر رہتے تھے ان کا ایک الگ مرتبہ تھا۔ ان کے متعلق اس آیت میں ہرگز یہ نہیں فرمایا گیا کہ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران: 160) انہوں نے تو رہنا ہی تھا ساتھ۔ ان پر تو یہ مضمون صادق آتا تھا کہ ''ہمیں تو راہرووں کی ٹھوکریں کھانا مگر جانا'' یعنی محبوب کی گلیوں میں۔ اس لئے قرآن کریم کی ہر آیت کو اس کے موقع محل کے مطابق چسپاں کرنا چاہئے لیکن ایک بڑی جماعت ایسی تھی جو تربیت میں وہ مرتبہ نہیں رکھتی تھی۔ وہ ہر لمحہ دلداری کے محتاج تھے اور دلداری کے رستوں سے وہ رفتہ رفتہ محمد رسول اللہ ﷺ کے قریب آتے رہے، قریب تر ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ پھر اس مرتبہ اور مقام پہ پہنچے کہ جس کے متعلق قرآن کریم نے ان کے ثبات قدم کی گواہیاں دیں۔ پس وہ جو مضمون ہے وہ عمومی تربیت

کا مضمون ہے کہ جو امیر مقرر ہو اور خاص طور پر جو خدا تعالیٰ کی طرف سے امیر مقرر ہو اس کے اوپر کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ انسانی فطرت کو نظر انداز کر کے محض اس وجہ سے کہ اللہ نے اسے مامور بنا دیا ہے وہ یہ سمجھے کہ اب ہر شخص کا فرض ہے میری اطاعت کرے اور اطاعت میں حد کمال کو پہنچ جائے مگر میں بس صرف مامور بن کر بیٹھا رہوں گا میرا کام اطاعت قبول کرنا ہے اس سے بڑھ کر نہیں۔ یہ درست نہیں ہے۔ یہ فطرت انسانی کے خلاف بات ہے اور قرآن فطرت کے مطابق ہے۔

اور قرآن یہ بھی بتانا چاہتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے خدام میں جو اطاعت کے بے مثال نمونے تم دیکھتے ہو اس میں تم ان کے لئے جتنی بھی دعائیں کرو بے شک کرو مگر یاد رکھو کہ اس کا اصل کریڈیٹ، اس کا اصل سہرا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے سر پر ہے کیونکہ آپؐ نے اپنے پیار، محبت، مغفرت، عفو اور ان کی خاطر تکلیفیں اٹھا کر خود ایک مقام پیدا کر لیا اور ایک ایسا مقام پیدا کیا ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ کی یہ صفات نہ ہوتیں تو ان میں جو نمونے تم دیکھتے ہو وہ نظر نہ آتے۔ پس یہ ان کی ذاتی خوبی نہیں۔ یہ اطاعت بھی محمد رسول اللہ ﷺ کے حسن کا ہی ایک عکس ہے۔ تو یہ آیت کریمہ ہمیں اس طرف بھی متوجہ کر رہی ہے کہ ہر وہ شخص جو مامور ہے کسی پہلو سے خواہ محدود دائرے میں ہو، ایک زعیم بھی جو انصار اللہ کا زعیم ہے وہ بھی محدود دائرے میں ایک مامور ہے، ایک زعیم بھی جو خدام الاحمدیہ کا زعیم ہے وہ بھی تو اپنے دائرے میں اور محدود دائرے میں ایک مامور ہے۔ تو ہر شخص جس کا حکم مانا جائے اسے مامور کہا جاتا ہے یعنی اس کی بات مانی جائے گی۔ ان معنوں میں نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کوئی منصب ماموریت عطا فرمایا ہے جو انبیاءؑ کو دیا جاتا ہے، یہ الگ مضمون ہے۔ مگر مامور کا عام معنی یہی ہے کہ اپنے دائرے میں صاحب اختیار ہو، صاحب امر ہو۔ اس پہلو سے خواہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو اسے یاد رکھنا ہوگا کہ جن لوگوں پر مامور ہے ان کے دل جیتنے میں اسے لازماً محنت کرنی ہوگی اور ان کے طبعی فطری تقاضے پورے کرنے ہوں گے۔ پس وہ امیر جو امیر بن کر یہ اہم اور بنیادی نکتہ نظر انداز کر دیتا ہے وہ بیوقوف بھی ہوگا اور ایک قسم کا اس میں تکبر بھی پایا جائے گا۔ بیوقوف اس لئے کہ جو مرکزی نکتہ قرآن کریم نے بار بار سمجھایا جس کے بغیر امارت مکمل ہو ہی نہیں سکتی اسے نظر انداز کر بیٹھا ہے اور تکبر ان معنوں میں کہ اگر رسول اللہ ﷺ کے متعلق قرآن یہ فرماتا ہے کہ اگر یہ صفات تجھ میں نہ ہوتیں تو انہوں نے بھاگ جانا تھا، اپنے متعلق وہ کیسے سوچ سکتا ہے کہ مجھ میں نہ بھی ہوں تو فرق کوئی نہیں پڑتا انہوں نے ماننی ہی

مانتی ہے۔ اگر وہ مانتے ہیں تو پھر تمہاری وجہ سے نہیں بلکہ عمومی نظام جماعت کی برکت سے مانتے ہیں اور وہ بھی آنحضرت ﷺ کی خاطر مانتے ہیں۔ وہ دہرے ثواب کماتے ہیں اور تم مجرم بن جاتے ہو۔

پس کسی امارت پر فائز ہونا کوئی معمولی امر نہیں ہے، اس کے بہت گہرے تقاضے ہیں، انہیں لازماً پورا کرنا ہوگا۔ مگر جہاں تک نافرمانی والے کا تعلق ہے اس کا یہ عذر کبھی قبول نہیں ہوسکتا کہ چونکہ اس نے مجھ سے حسن سلوک نہیں کیا تھا اس لئے میں نافرمانی کا حق رکھتا ہوں۔ یہ بات بھی یاد رکھیں۔ قرآن کریم نے ان کو جو رسول اللہ ﷺ کی اگر سختی کی وجہ سے دور ہٹے ہوں ہرگز یہ حق تسلیم نہیں کیا کہ ان کو ہٹنے کا حق تھا۔ ان کی ایک نفسیاتی کمزوری بیان فرمائی ہے۔ ورنہ جو اطاعت کا اعلیٰ حق ہے اس میں کسی شخص کی ذاتی کمزوری یا ذاتی صفات کا کوئی بھی دخل ہونا نہیں چاہئے۔ اطاعت کے زاویے سے دیکھیں یعنی مطیع کے زاویے سے دیکھیں تو پھر یہ مضمون یوں نکلے گا کہ مطیع کو اگر اس کا مطاع یعنی جس کو امر کا اختیار دیا گیا ہے باوجود اس کے کہ اس کے ساتھ حسن سلوک نہیں کرتا اپنے دائرہ اختیار میں حکم دیتا ہے تو مطیع کا فرض ہے کہ لازماً قبول کرے اور یہ عذر نہیں رکھے کہ چونکہ اس نے مجھ سے حسن سلوک نہیں کیا اس لئے میں حق رکھتا ہوں کہ اس کی اطاعت سے باہر چلا جاؤں۔ یہ حق قرآن کریم نے کہیں بھی کسی کو نہیں دیا۔

جہاں تک مومن کا تعلق ہے ان کی ایک ہی آواز بیان فرمائی ہے جو حضرت محمد رسول اللہ کی آواز کے تابع اٹھی اور یک جان ہو کر اٹھی ہے اور یہ آواز تھی سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ (البقرۃ:286) ہمیں تو اس کے سوا کچھ نہیں پتا۔ ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی۔ جو سنا اس پر عمل کیا۔ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ اور سننے اور اطاعت ہی میں اے رب ہمیں تیری غفران کی حرص ہے۔ ہم جو سنتے ہیں اور اطاعت کرتے ہیں تو اس غرض سے نہیں کہ جس کی اطاعت کرتے ہیں اس سے کوئی فیض ہمیں پہنچے گا یا اس کی محبت بذات خود ہمارا مطمع نظر ہے۔ یہ سب کچھ تو اس لئے ہے کہ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا تا کہ تو ہم سے مغفرت کا سلوک فرمائے۔ وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ہم نے آخر تیرے حضور پہنچنا ہے۔ سارا حساب کتاب تیرے حضور پیش ہوگا۔

تو سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا کا مضمون ایک وہ ہے جو آنحضرت ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کے خدا تعالیٰ کی جانب رخ سے ہمیں معلوم ہوا۔ جب خدا کی طرف اپنا رخ فرمایا تو ہر وہ شخص جو اللہ کی

طرف سے تھا اس کے متعلق یہ اعلان ہوا ہے سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ہمارا اور کوئی کام نہیں ہے لیکن جہاں جس کو مامور بنایا گیا ہے اس کے رخ سے دیکھیں تو اسے سمع اور اطاعت کی روح پیدا کرنے کے لئے اپنی جان کی قربانی کرنی پڑتی ہے۔ اپنے آرام کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ وہ تمام نفسیاتی تقاضے پورے کرنے پڑتے ہیں جن کے نتیجہ میں پھر یہ ایسی جماعت پیدا ہو۔ تو ایک طرف سے مضمون کو دیکھا جائے تو مضمون بعض دفعہ بگڑ جاتے ہیں اور غلط استدلال پیدا ہو جاتے ہیں اور لوگ غلط استدلال کے نتیجہ میں خود اپنی ہلاکت کا موجب بن جاتے ہیں۔ اب یہی صورت حال اگر آج کل کے حالات پر جو جماعتوں میں رونما ہوتے رہتے ہیں چسپاں کر کے تفصیل سے دیکھیں تو آپ کے سامنے یہ مسئلہ خوب کھل کے آجائے گا۔ ایک امیر ہے جو اپنی رحمت اور شفقت کے تقاضے پورے نہیں کرتا۔ ذاتی تعلقات کو محض اس لئے نہیں بڑھاتا کہ خدا کی خاطر اب وہ مجبور ہے اور برداشت اور حوصلہ پیدا نہیں کرتا اور اس فکر میں نہیں رہتا کہ جس طرح بھی ممکن ہے مجھ سے محبت اور احسان کے رشتوں میں یہ لوگ باندھے جائیں۔ وہ امیر اپنی جماعت میں ویسی اطاعت کے نمونے نہیں دیکھ سکتا۔ ناممکن ہے بلکہ بسا اوقات وہاں ٹھوکر کے واقعات کثرت سے دکھائی دیں گے۔ چھوٹی سی بات ہوئی اور لوگ ناراض ہو کے بھاگ گئے۔ امیر سے نہیں بھاگے اپنی عاقبت سے بھاگ گئے۔ اپنی آخرت تباہ کر لی۔ لیکن اس صورت میں دونوں یکساں ذمہ دار نہیں ہیں تو کم سے کم کچھ نہ کچھ ذمہ داری دونوں پر عائد ہوتی ہے۔ برابر کا لفظ کہنا مشکل ہے اللہ بہتر جانتا ہے۔ بعض دفعہ ایک ذمہ داری کسی پر کم کسی پر زیادہ مگر ذمہ دار دونوں ہیں اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ ان لوگوں کی بدنصیبی ہے جو ایسے امیر کی امارت میں ہیں جو ان سے رحمت اور شفقت کا سلوک نہیں کرتا اور اس امیر کی بھی بدنصیبی ہے جو کرتا بھی ہو تو کچھ خود سروں کا امیر بنایا گیا ہے کیونکہ بعض دفعہ یہ امیر کے قصور کی وجہ سے خود سری نہیں آتی بعض جماعتوں میں کچھ گھٹلیاں بن جاتی ہیں۔ کچھ شریروں کی گھٹلیاں جن کا شغل ہی یہ رہتا ہے کہ کچھ ایک گروہ یہاں بنا لیا ایک گروہ وہاں بنا لیا اور تاک میں رہتے ہیں کہ امیر سے جو بھی ہو جب بھی کوئی غلطی ہو اس کو پکڑیں اور بلند آواز سے کہیں کہ یہ دیکھو یہ حرکتیں کر رہا ہے ہم اس کے ساتھ نہیں چل سکتے۔ موقع ملے تو دھمکیاں بھی اس کو دیں۔ ایسے ظالموں کی کینسر کی گھٹلیاں بھی کئی جگہ موجود ہیں اور جہاں یہ موجود ہیں وہاں امیر کو ہم نے بدل بدل کے دیکھ لیا۔ انتہائی رافت کرنے والا، شفقت

کرنے والا امیر بھی بھیجیں تو اس کے ساتھ وہی بدتمیزی کا سلوک ہوگا بلکہ بعض دفعہ نسبتاً سخت امیر کے سامنے یہ لوگ جھک جاتے ہیں اور بعض دفعہ اس نیت سے سخت امیر مقرر کرنا پڑتا ہے کیونکہ یہ لوگ نیکی اور شفقت اور رحمت کی زبان سے بالکل نابلد ہو جاتے ہیں۔ان کو پتا ہی نہیں یہ زبان ہوتی کیا ہے۔وہ دوسری زبان کسی حد تک سمجھتے ہیں۔کوئی مضبوط امیر ہو جو بدتمیزیاں برداشت نہ کرے اور آگے سے اسی طرح دوٹوک جواب دے سکے تو وہ ماحول تو نہیں ہے جو اسلامی ماحول ہے اس کو تو میں ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا۔مگر بیماروں کی دنیا میں صحت مند قانون چلا بھی تو نہیں کرتے۔وہاں پھر یہ مضمون صادق آتا ہے جیسی روح ویسے فرشتے۔روح ہی بد ہے تو فرشتے بھی تو ویسے ہی سخت گیر ہوں گے۔چنانچہ قرآن کریم نے اس مضمون کو جہنم کے تعلق میں بیان فرمایا ہے۔کہتا ہے جہنم کے فرشتے بھی بڑے سخت گیر ہیں۔کوئی رحم نہیں جانتے۔وہ جہنمی چیختے چلاتے رہتے ہیں کہ اے جہنم کے داروغے ہمارے لئے خدا سے کچھ مانگ۔وہ کہتا ہے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ان کی سخت گیری جو ہے وہ اٹل ہے اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔تو جیسی روح ویسے فرشتے کا مضمون محض محاورہ نہیں۔قرآن سے ثابت ہے کہ جیسے جیسے لوگ ہوں ویسے ویسے ہی فرشتے ان پر مسلط کئے جاتے ہیں۔چنانچہ مرتے وقت کے فرشتے آتے ہیں۔جو نیک لوگوں کے فرشتے ہیں وہ ان کے لئے آسانیاں پیدا کر رہے ہیں ان کو محبت اور پیار سے تیار کرتے ہیں اپنے رب کے حضور حاضر ہونے کے لئے اور خوشخبریاں دیتے ہیں کہ تم ایک تکلیف کے مقام سے ایک آرام کے مقام کی طرف منتقل ہو رہے ہو اور جو سخت گیر فرشتے ہیں وہ ان لوگوں پر آتے ہیں جو ظالم ہیں۔ساری عمر انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کئے ہوں۔ان کو کہتے ہیں خود اپنی جانیں نکال کر باہر لاؤ۔اب اس قسم کا سخت منظر ہے کہ اس کو قرآن کریم میں پڑھتے ہوئے انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔تو اس لئے یہ کہنا کہ بعض دفعہ لوگ سخت گیر مزاج کے مستحق ہو جاتے ہیں یہ قرآنی مضامین سے مختلف نہیں۔مگر اسے مثالی ماحول بہرحال نہیں کہا جا سکتا۔

مثالی ماحول تو وہی ہے جو آنحضرت ﷺ سے ثابت ہو اور آپؐ نے اپنی تمام زندگی میں اطاعت کو قائم کرنے میں جو نمونے دکھائے ہیں ان نمونوں کی پیروی کر رہا ہو۔اگر سو فیصدی نہیں تو کوشش ضرور ہو کہ ویسے نمونے پیدا ہوں۔جہاں یہ صورت حال ہو وہاں حضرت مسیح موعودؑ کی جماعت میں یہ خوبی ہے کہ وہ پھر اپنی جان بھی ایسے امیروں پہ نچھاور کرنے لگتی ہے۔صدر ہو خدام الاحمدیہ

کا، قائد ہو، زعیم ہو ان سب سے قطع نظر اس کے کہ ان کا کوئی رشتہ کوئی دوستی کا تعلق، کچھ مزاج میں ہم آہنگی ہے کہ نہیں وہ لوگ گہری محبت کا سلوک کرتے ہیں۔ ان کا خیال رکھتے ہیں۔ ان کی ہر بات کو قبول کر کے ہر پہلو سے اس پر عمل درآمد کی کوشش کرتے ہیں۔

پس اس پہلو سے جماعت کی تاریخ میں بہت سی بڑی بڑی جماعتوں کی ایسی مثالیں ہیں جہاں اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ کسی ایک امیر نے ایسا سلوک کیا تو آج تک ان جماعتوں کو اسی امیر کا فیض نصیب ہو رہا ہے اور اس کی نیکیوں کا پھل آج تک کھا رہے ہیں۔ اس کے لئے دعائیں نہ کریں تو ان کی بے پرواہی ہے، ناشکری ہے۔ مگر جو شخص نیک روایات پیچھے چھوڑ جائے، جس نے عرق ریزی کے ساتھ اور اپنا خون بہا کر محنت کر کے وہ پاکیزہ ماحول بنایا ہو جو بہترین اسلامی ماحول ہے جس میں امیر اپنے ماتحتوں پر فدا اور ماتحت اپنے امیر پر فدا، اس کی رضا پر نظر رکھنے والے ہوں یہ ماحول پھر بعض دفعہ نسلاً بعد نسلٍ ان لوگوں پر احسان کرتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ بعض شریر اس کو بدلنے کی کوشش کریں، اس کے مزاج کو بگاڑ دیں۔ پس یہ وہ باریک باتیں ہیں جن میں سے ہر بات پر نظر رکھنی ہوگی۔

جماعت کو سمجھنا چاہئے کہ ہمارا دائرہ اختیار کیا ہے۔ اطاعت کہتے کس کو ہیں اور یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اطاعت تو اصل وہ ہے کہ مرضی کے خلاف ہو اور جان کی قربانی پیش کرنی پڑے۔ امیر، بحیثیت امیر جماعت کے تصور میں نہیں وہ بھی، جو بھی جس کو خدا نے کسی حکم پر فائز فرمایا ہو، جس دائرے میں بھی ہو، اس سے اگر غلطی بھی ہو جاتی ہے تو اس غلطی کو نظر انداز کر کے اپنے اطاعت کے فرائض میں کوئی رخنہ نہ پیدا ہونے دیں اور اس مضمون کو یاد رکھیں کہ میں اپنی جان، مال، عزت اور وقت کو قربان کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہوں گا۔ یہ اطاعت کا وہ مضمون ہے جس کو حضرت مصلح موعودؓ نے اس عہد کی صورت میں ہمیں سمجھایا کہ اطاعت محض خشک اطاعت کا نام نہیں ہے کہ مرضی کی بات ہو تو اطاعت کرو، جہاں تکلیفیں اور آزمائشیں سامنے آئیں وہاں اطاعت سے پیچھے ہٹ جاؤ۔ جان، مال عزت اور وقت کو قربان کرنے کے لئے تیار رہوں گا۔ بعض لوگوں کو تو میں نے دیکھا ہے کہ یہ بھی لکھتے ہیں اس امیر نے لمبی باتیں کیں، ہمارا وقت ضائع کیا۔ فلاں بات کی ہمارا وقت ضائع کر دیا۔ اگر وہ ٹھیک ہے تو میرا فرض ہے کہ اس امیر کو سمجھاؤں اور اگر اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے تو وہ سرزنش کا

سزاوار ہو گیا ہے لیکن آپ کا یہ کام نہیں کہ امیر پر روزمرہ اٹھ کر ایسی باتیں کریں تم مجلسوں میں لمبی باتیں کرتے ہو ہمارا وقت ضائع کرتے ہو، بلایا ہے کوئی خاص بات بھی نہیں تھی۔ یہ دل کی بدتمیزیاں ہیں۔ ان کو حقوق قرار نہیں دیا جا سکتا کہ ماتحت کے حقوق ہیں۔ ماتحت کا حق ہے تو امیر پر ہے کہ ان کے حقوق کا خیال رکھے لیکن ماتحت اس قسم کی باتیں خود نہیں کہا کرتا۔

آنحضرت ﷺ کو اپنے غلاموں کا اتنا خیال تھا کہ نماز سے بڑھ کر اور کون سا لمحہ ہے جو آپ کے دل کو اپنی طرف کھینچ رہا ہو مگر ایک بچے کے رونے کی آواز آپؐ کو نماز چھوٹی کرنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ اس خیال سے کہ اس کی دردناک آواز اس کی ماں کے دل پر کیا اثر کرتی ہوگی نماز جلدی ختم کر دی لیکن کہیں ہم نے نہیں سنا کہ مائیں چیخ اٹھی ہوں کہ اے خدا کے رسول ﷺ تجھے نمازوں کی فکر پڑی ہوئی ہے ہمارے بچے رو رہے ہیں اور تجھے پرواہ ہی کوئی نہیں۔ یہ جہالت تھی اگر ہوتی۔ لیکن یہ شانِ محمد مصطفیٰ ﷺ ہے کہ ایسا موقع آنے کا سوال ہی نہیں پیدا کبھی ہوا۔ وہ شخص جو دوسروں سے بڑھ کر ان کی تکلیفوں کا خیال رکھتا ہو اس کے اوپر جائز حملہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ تم نے بے پرواہی کی ہے اور اس پہلو سے آنحضرت ﷺ کی ساری زندگی میں ایک مرتبہ بھی کسی مسلمان کو یہ کہنے کا حق نہیں ملا کہ آپ نے ہم سے بے پرواہی کی اس کے نتیجہ میں ہم سے یہ واقعہ ہو گیا کیونکہ آپؐ سب کی ضرورتوں پر اپنی ضرورتوں کو قربان کر دیا کرتے تھے اور اس حد تک کرتے تھے کہ تعجب ہوتا ہے کہ انسان میں اتنی طاقت کیسے ہے، ناممکن دکھائی دیتا ہے۔

بعض دفعہ بعض چیزیں اچھی بھی لگتی ہیں لیکن انسان اس حد تک ان پر عمل کر ہی نہیں سکتا جب تک اس کے سارے نظام کے اندر، اس کے اندرونی نظام کے اندر گہری تبدیلیاں واقع نہ ہوں۔ پس آنحضرت ﷺ کے بعض کردار ایسے ہیں جن کو دیکھ کر ان کی عظمت کی وجہ سے سر سے ٹوپی گرتی ہے۔ اتنے بلند ہیں۔ **مکارم الاخلاق** پر آپؐ کو فائز کیا گیا ہے۔ اس لئے یہ بھی درست ہے کہ ہم پر لازم ہے کہ ان کی پیروی کریں لیکن یہ کہنا بھی جائز نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے تو یہ کیا تھا تم نے تو بالکل ویسا نہیں کر کے دکھایا۔ اخلاق کے مضمون میں اور انصاف کے مضمون میں ایک فرق ہے۔ انصاف کے تقاضے اگر امیر پورا نہیں کرے گا تو مجھ پر لازم ہے کہ میں اس کو پکڑوں لیکن قربانی کے وہ نمونے نہ دکھا سکے جو آنحضرت ﷺ نے دکھائے ہیں تو صرف یہ نظر ہوگی کہ کوشش کرتا ہے کہ

نہیں۔اسے نصیحت تو کی جاسکتی ہے کہ تم یہ بھی تو کر سکتے تھے۔اس طرح بھی دل جیت سکتے تھے۔یہ قربانی،اس قربانی کا مظاہرہ کر سکتے تھے مگر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اسے سرزنش کی جائے اور سختی کی جائے کیونکہ دو الگ الگ مضمون ہیں۔

آنحضرت ﷺ صرف فرائض کی دنیا تک نہیں رہے۔آپ کا قدم احسان کی طرف بلند ہوا ہے اور احسان سے ایتاء ذی القربیٰ میں جا کر یوں معلوم ہوتا ہے کہ بلندیوں میں آپ ﷺ کا وجود ہماری نظر کی رسائی سے بھی آگے نکل چکا ہے۔اس لئے ہر ایسی کوشش جو آپ ﷺ کی سنت کے مطابق ہے وہ بھی تجزیہ کے لحاظ سے مختلف مراتب رکھتی ہے۔بعض جگہ وہ کوشش فرض میں داخل ہے۔بعض جگہ وہ کوشش نوافل میں داخل ہے لیکن نوافل کہہ کہ اسے نظر انداز کرنے والا بھی فرض کو نظر انداز کر رہا ہے۔اب بظاہر اس بات میں تضاد ہے لیکن کوئی تضاد نہیں ہے۔ایک فرائض کی دنیا ہے اس میں امیر کا فرض ہے کہ ان سب تقاضوں کو پورا کرے جو امیر کے اوپر لازماً عائد ہوتے ہیں اور جماعت سے ایک خاص رنگ کا سلوک جس کی تفصیل میں آپ کو بتاؤں گا اس طرح وہ سلوک کرے اور کسی سے کوئی امتیاز نہ کرے لیکن کس حد تک وہ ان کی بدتمیزیوں کو برداشت کرے گا،کس حد تک ان کے دکھوں پر شکوہ نہ کرتے ہوئے دعا کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے ان کی مدد چاہے یہ وہ احسان والا مضمون ہے جس کے متعلق ہر شخص کے اپنے اپنے حالات ہیں،اپنی اپنی صلاحیتیں ہیں۔ان صلاحیتوں کے علاوہ ہر شخص کا پس منظر الگ الگ ہے،اس کا خاندان الگ الگ ہے۔جس خاندان میں وہ پل کر بڑا ہوا ہے اس کے روزمرّہ کے معاملات کے طریق اس پر اثر انداز ہیں،اس کی طبیعت پر ایک چھاپ لگ گئی ہے۔یہ خیال کر لینا کہ حضور اکرم ﷺ کی سنت کا حوالہ دے کر اچانک اس کو نرم رُو بنا دو گے یہ ممکن نہیں ہے۔لیکن اگر وہ یہ کہے کہ میں چونکہ سخت رُو ہوں اور میں نے اپنے ماں باپ سے یہ سختیاں سیکھی ہوئی ہیں اس لئے مجھے حوالہ نہ دو سنت کا یہ اس کی فرض ناشناسی ہوگی بلکہ گستاخی اور بدتمیزی ہوگی۔اس کا صرف یہ کام ہے کہ ہاں میں نے سن لیا،میں ادب کرتا ہوں،احترام کرتا ہوں جو تم نے حوالہ دیا ہے بہت بڑا ہے۔میری مجال نہیں ہے کہ اس کے خلاف کچھ کہہ سکوں مگر تم بھی دعا کرو میں بھی کوشش کروں گا کہ آئندہ اس پہلو سے بہتر نمونہ دکھا سکوں۔

پس جو فرائض جس جس پر عائد ہوتے ہیں،جو جو حسن و احسان کے تقاضے جس جس پر عائد

ہوتے ہیں ان کی کوشش کرنا اور دیانتداری سے کوشش کرنا نظام جماعت کی حفاظت کے لئے اور اس کے استحکام کے علاوہ اس کی بقاء اور ہمیشہ ہمیش جاری رکھنے کے لئے بڑا ضروری ہے، بہت ضروری ہے۔ یہ باریک پہلو ہیں جن کے اندر نظام جماعت کی جان مضمر ہے۔ ان باریک پہلوؤں سے نظر اٹھائیں گے تو اسی حد تک نظام جماعت بیمار پڑنا شروع ہو جائے گا۔ اس کے اندر ایسی کمزوریوں کی علامتیں ظاہر ہو جائیں گی جو رفتہ رفتہ پھر ایسے نظاموں کو پارہ پارہ کر دیا کرتی ہیں۔ تو میں جن باتوں کی طرف آپ کو توجہ دلا رہا ہوں ان کو معمولی نہ سمجھیں۔ میری نظر آئندہ لمبے عرصے تک ہے۔ **میری یہ تمنا ہے کہ جماعت احمدیہ ان اعلیٰ اخلاق پر اور ان اقدار پر اتنی مضبوطی سے قائم ہو جائے کم سے کم ان اقدار پر جو نظام جماعت کے لئے لازم ہے کہ پھر ہم اطمینان کی حالت میں اپنی جانیں خدا کے حضور سپرد کر سکیں۔** ہم کہہ سکیں کہ اے خدا جہاں تک ہم میں طاقت تھی، جہاں تک کوشش تھی ہم نے تیرے نظام کو زندہ رکھنے کے لئے اپنی زندگیوں کی قربانیاں پیش کر دی ہیں اور ہم خوشی سے تیرے حضور آ رہے ہیں یہ کہتے ہوئے، جانتے ہوئے کہ یہ جماعت اب ایک نسل میں تباہ ہونے والی جماعت نہیں رہی۔ نسلاً بعد نسلٍ ان کی خوبیاں تیرے قائم کردہ آسمانی نظام کی حفاظت کے لئے ہمیشہ قربانیاں پیش کرتی رہیں گی۔ یہ وہ روح اور جذبہ ہے جس کی خاطر میں آپ کو یہ باتیں سمجھاتا ہوں اور ان کی آزمائش کا وقت آپ پر روا نہ آتا ہے اور اس وقت اگر آپ بیدار مغزی سے اپنے حالات کا جائزہ لیں۔ یہ نہ دیکھیں کہ آپ کتنی دفعہ کامیاب ہوئے ہیں، کتنی دفعہ ناکام ہوئے ہیں تو اس وقت تک آپ کو یہ باتیں سننے کے باوجود بھی عمل کی توفیق نہیں مل سکتی۔ روزمرہ اپنی زندگی کے حالات میں ان کو جاری کر کے دیکھیں۔

اب میں واپس آتا ہوں امیر کی ذمہ داریوں کی مزید تفصیل بیان کرتے ہوئے۔ جہاں تک امیر کے فرائض کا تعلق ہے اس پر لازم ہے کہ وہ سب سے یکساں ہو جائے اور سب سے یکساں ہونے کے لئے ایک اور اس میں خوبی پیدا ہونا ضروری ہے کہ وہ چند لوگوں کو اپنے اوپر قبضہ نہ کرنے دے۔ یہ فطری کمزوری کا رجحان ہے جو ہمیں دنیا میں ہر نظام میں ملتا ہے جو بالآخر اس نظام کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔ بھٹو صاحب جب برسرِ اقتدار آنے والے تھے اور ان کی مجلس لگی ہوئی تھی ایک ہوٹل میں تو میرا چونکہ ان کے ساتھ آنا جانا تھا، تعلقات تھے، میں بھی ان کو مبارک باد دینے گیا۔ تو

انہوں نے مجھے یہ کہا کہ ملتے رہا کرو آئندہ بھی۔ مطلب یہ تھا کہ اب میں حکومت میں آ گیا ہوں لیکن یہ مطلب نہیں کہ میں اپنے تعلقات کو اس وجہ سے قربان کر دوں کہ میں کوئی بڑا آدمی بن گیا ہوں۔ شاید ان کے ذہن میں یہ تھا یا کچھ اور بات ہوگی۔ میں نے ان سے کہا کہ میں تو آئندہ ملنے جلنے کا وعدہ لینے کے لئے نہیں آیا۔ یہ بتانے آیا ہوں کہ اب ملنا جلنا ختم ہو گیا ہے۔ اچانک ساری مجلس پر ایک سناٹا سا چھا گیا کہ کیسی عجیب بات کر گیا ہے یہ اور بھٹو صاحب نے ایک دم سب باتیں چھوڑ کر میری طرف متوجہ ہو کے سوال کیا، کیا؟ یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔ یہ کہنے آئے ہو کہ اب تم مجھ سے ملنا جلنا بند کر دو گے۔ میں نے کہا ہاں میں یہی کہنے آ رہا ہوں۔ کہتے ہیں کیا مطلب ہے۔ میں نے کہا مطلب یہ ہے کہ میں نے سیاست کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہوا ہے اور مشہور جو بڑی بڑی شخصیتیں ہیں ان پر میری نظر رہی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اچھے سے اچھا سیاست دان بھی نیک سے نیک نیتیں لے کے بھی جب اوپر آتا ہے تو اس کے اردگرد جو جھوٹی تعریفیں کرنے والے اس کی طاقت میں Share کرنے کی خاطر، اس میں حصہ ڈالنے کی خاطر اس سے چمٹ جاتے ہیں جیسے مکھی گڑ پہ بیٹھ جائے آ کے۔ وہ ہیں جو اس گڑ کو ناپاک کر دیتے ہیں پھر اور بڑے بڑے سیاست دان جو بڑی نیک اور پاک نیتیں لے کے آئے تھے جب طاقت پر قابض ہوئے تو ان ظالموں نے جو اردگرد اکٹھے ہو جاتے ہیں انہوں نے ان کو خراب کر دیا اور میں جھوٹی تعریف لے کر کبھی کسی سے نہیں مل سکتا اور سچی بات پھر حاکم کو بری لگتی ہے اور سیاست دان برداشت کر لیتا ہے جب تک وہ حاکم نہ ہو۔ اب آپ صرف سیاست دان ہی نہیں رہے آپ حاکم ہو گئے ہیں اور میں وہی ہوں مجھ پر کوئی تبدیلی نہیں۔ نہ مجھے آپ سے کوئی حرص، نہ کوئی لالچ اور ملنا نہ ملنا اس پہلو سے برابر ہے۔ تو مجھے خطرہ ہے کہ اب میں ملا اور میں نے سچی باتیں کیں تو پھر آپ کو تکلیف پہنچے گی تو بعد میں جو تعلق توڑنے ہیں ابھی کیوں نہ توڑ لئے جائیں۔ یہ باقی جو باتیں ہیں اس کو میں چھوڑتا ہوں۔

میں مثال دے رہا ہوں کہ یہ جو مضمون ہے کہ ایک صاحب اقتدار کو لوگ گھیرے میں لے لیتے ہیں یہ ایک دائمی مضمون ہے۔ تمام دنیا کی تاریخ پر اس کا برابر اطلاق ہوتا ہے اور اس تاریخ کا محض سیاست سے تعلق نہیں۔ اقتصادیات سے بھی تعلق ہے اور دوسرے انسانی زندگی کے دائروں سے بھی تعلق ہے۔ جہاں کسی آدمی کو بڑا ہوتے دیکھیں وہاں پرانے رشتے یاد آ جاتے ہیں۔ پرانے

تعلقات کے حوالے سے انسان اس کے گرد اکٹھا ایک جمگھٹ شروع کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ مجھے یاد ہے مجھے اس پہ ہنسی بھی بہت آئی مگر واقعہ ہے جو انسانی فطرت کی کمزوری کو ظاہر کرنے کے لئے دلچسپ ہے۔ ایک احمد نگر کی خاتون تھیں ان کے بیٹے نے ذکر کیا کہ ضیاء الحق صاحب کا یہ حال ہے دیکھو ذرا اخلاق۔ میری ماں نے فون کیا تو فون ہی نہیں اٹھایا اس کا اور ہونے ہی نہیں دیا حالانکہ وہ بھی آرائیں ہم بھی آرائیں۔ اب آرائیں کا رشتہ اور وہ بھی جالندھر کے یہ بھی جالندھر کے تھے یہ اتنا پکا ہو گیا کہ پہلے ساری عمر تو ضیاء کا خیال نہیں آیا ان کو، وہ حکومت پہ آیا تو آرائیت جاگ اٹھی اور اس خیال سے اس کے گرد اکٹھے ہونے لگ گئے۔

یہ گرد اکٹھے ہونے والے بعض دفعہ بہت ہی خطرناک نتیجے پیدا کرتے ہیں اور جماعت میں یہ نہیں ہونے دینا چاہئے کسی قیمت پر بھی۔ اگر آپ کے گرد کچھ لوگوں نے ایسا گھیراؤ کر لیا جو آپ کو جماعت سے الگ کر دیں ان معنوں میں کہ جماعت کے تمام تاثرات ان سے فلٹر ہو کر آپ تک پہنچیں اور براہ راست جماعت میں یہ اعتماد نہ رہے کہ آپ ان کے اسی طرح برابر ہیں اور ان کے خلاف اسی طرح بات سننے کے لئے تیار ہیں جیسے ان کی بات سنتے ہیں تو پھر آپ کی امارت اسی حد تک کمزور پڑ جائی گی۔ اس لئے بہت ہی احتیاط کی ضرورت ہے۔ کچھ لوگوں نے جنہوں نے خدمتیں کرنی ہیں انہوں نے اکٹھے ہونا ہی ہونا ہے لیکن اب یہ آپ کا کام ہے کس کو اکٹھے کرنا ہے۔ کس کو اکٹھے اپنے گرد جمع نہیں ہونے دینا اور اگر ہوتے ہیں تو اس کو اپنے مرتبے اور مقام پہ رکھیں۔ ان کی مجال نہیں ہونی چاہئے کہ آپ کے ان معاملات میں دخل انداز ہوں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے سپرد فرائض منصبی کے طور پر کئے ہیں۔ ایسی صورتوں میں صرف یہ جماعت کے دوسرے افراد کا تعلق نہیں۔ میں نے دیکھا ہے بعض لوگ بیویوں کے زیر اثر آجاتے ہیں اور فرائض ہیں امارت کے یا صدارت کے اور بیوی کے جو تعلقات ہیں دوسری عورتوں سے وہ تعلقات اس کے فرائض منصبی پر اس طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ وہ یہ بتاتی ہے فلاں جو عورت ہے نا اس کا خاوند تو بہت بے ہودہ ہے اور وہ ایسا ہے یا فلاں عورت جو ہے وہ بیچ میں سے آپ کو پسند نہیں کرتی۔ فلاں ماحول میں یہ باتیں ہو رہی ہیں۔ وہ کچے کانوں والا خاوند، وہ زنخوں کی طرح اپنے فیصلے پر چلنے کی بجائے اپنی بیوی کے تابع چلتا ہے جب کہ یہ دلداری اور اخلاق نہیں ہیں۔ یہ بزدلی اور نامردی ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ نظام جماعت سے

بے وفائی ہے۔ کسی عورت کا کوئی کام نہیں ہے کہ جس منصب پر اس کا خاوند فائز ہوا ہے اس منصب سے تعلق میں کسی طرح بھی اس پر اثر انداز ہو۔ سوائے مغفرت رحم اور شفقت کے۔ یہ الگ مضمون ہے۔ شفقت اور رحمت اور مغفرت کی استدعا کرنا یہ تو بالکل اور بات ہے مگر پولیٹیکل Issue بنالینا اس کو کہ چونکہ میرا خاوند ایک مامور ہے کسی منصب پر اس لئے میں اس کو بتاؤں کہ فلاں اچھا ہے، فلاں برا ہے، فلاں یوں کرتا ہے، فلاں یوں کرتا ہے۔ یہ باتیں بالکل ناجائز ہیں، کسی قیمت پر قبول نہیں ہونی چاہئیں۔

اس پہلو سے اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ میں نے جو اپنی بیوی سے تعلق رکھا ہمیشہ صرف ایک دفعہ ایک واقعہ ہوا کہ حضرت خلیفۃ المسیح نے کچھ ناراضگی کا اظہار کیا مجھ پر تو میری بیوی کے دل پہ چوٹ لگی تو اس نے کچھ لفظ کہے۔ اس دن میں نے ان کو کہہ دیا کہ آج کے بعد پھر یہ نہیں ہوگا۔ کبھی ہوا تو تم سے کاٹا جاؤں گا اور خلیفۂ وقت کا ہو کے رہوں گا۔ چاہے وہ مجھے جوتیاں ماریں چاہے مجھے غلام رکھیں مجھے تمہاری محبت پسند نہیں ہے اس غلامی کے بدلے جس پر تمہارے الفاظ کا منفی اثر میں نے دیکھا ہے۔ وہ دن اور موت کا دن ایک دفعہ بھی کبھی ساری عمر انہوں نے میرے فرائض کے تعلق میں کبھی اثر انداز ہونے کی کوشش نہیں کی۔ میں صدر خدام الاحمدیہ رہا، میں وقف جدید میں رہا، میں انصار اللہ میں بھی رہا اشارۃً یا کنایۃً بھی انہوں نے مجھے کبھی کوئی بات نہیں کہی اور یہی حال ہمارے گھر کے ماحول کا تھا ہمارے نوکروں، ہمارے بچوں کا۔

بعض دفعہ لوگ ایسے بے وقوف ہیں اور ایسے کجی فطرت کے لوگ ہوتے ہیں، کجی عادتوں کے، کہ وہ اپنی عادتیں دوسرے کی طرف اس طرح منتقل کر دیتے ہیں۔ ایک لکھنے والے نے مجھے لکھا کہ وہ جو ساری عمر آپ کے گھر نوکر رہی ہے وہ آپ کے اوپر چونکہ اثر انداز ہو جاتی ہے باتیں کر کے اس لئے آپ نے بعضوں کے متعلق اچھی رائے قائم کر لی ہے بعضوں کے متعلق نہیں۔ اس بے چاری کا تو یہ حال ہے کہ اس کے داماد کو میں نے جماعت سے خارج کیا اور مجال نہیں کہ اشارۃً بھی کبھی کوئی زبان پہ حرف لائی ہو۔ وہ جانتی ہے اس کی تربیت میرے گھر میں ہوئی ہے اس کو پتا ہے کہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ جماعتی معاملات میں اسے زبان کھولنے کی اجازت دی جائے گی۔ پس یہ میں اس لئے مثالیں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں کہ میں ان تجربوں سے گزرا ہوا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ

کوششیں ہوتی ہیں اور مہلک ہوتی ہیں اور جو لوگ پھر قریبی بن جائیں، مصاحب بن کے رہیں جماعت میں، وہ سارے تقویٰ کا نظام بگاڑ کر رکھ دیتے ہیں کیونکہ پھر لوگوں کی نظر اللہ پر نہیں بلکہ ان کو خوش کرنے پر ہوتی ہے۔ یہ کوئی معمولی مصیبت نہیں ہے یہ تو ایک عذاب ہے جو امیر یا عہدیدار سہیڑ لے گا اگر وہ لوگوں کی باتوں میں آئے اور لوگوں کی باتیں سنے۔ یہ درست ہے کہ اگر نہ بھی سنیں گے تو الزام تو لگنے ہی ہیں جیسا کہ میں نے اپنے متعلق بتایا ہے الزام لگانے والے نے لگا دیا۔ مگر اس الزام تراشی سے تو محمد رسول اللہ ﷺ کو بھی الگ نہیں رکھا گیا، میری کیا حیثیت ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ پر بھی لوگ بدتمیزی سے زبانیں دراز کرتے ہیں اذن ہے یہ تو۔ یہ تو کان ہے لوگوں کی باتیں سنتا، ان پر عمل کرتا۔ فرمایا اذن خیر لکم۔ اذن تو ہے مگر اچھی باتوں کا اذن ہے۔ جہاں تمہاری بھلائی دیکھتا ہے اس کا کان جھک جاتا ہے اس طرف قبول کر لیتا ہے۔ جہاں برائی کا سوال ہے وہاں سوال ہی نہیں، ہرگز ممکن نہیں کہ آپ اس رسولؐ کو اذن کہہ سکیں کسی پہلو سے بھی۔ ہر بات کی تحقیق کرتا ہے، جائزہ لیتا ہے، انصاف کے تقاضے پورے کرتا ہے، پھر تسلیم کرتا ہے ورنہ سنی سنائی باتوں کو نہیں مانتا۔ تو خیر کے حق میں سنی سنائی بھی قبول کر لیتا ہے۔ جہاں بھلائی پہنچنی ہو وہاں ضروری نہیں کہ پہلے سو فیصدی ثابت ہو جائے کہ اتنا اچھا ہے اس لئے اس کو انعام دیا جائے۔ کسی نے اچھا کہا تو انعام کے لئے طبیعت کھل گئی اور انعام کا سلسلہ جاری بھی ہو گیا۔ یہ اذن خیر ہے۔ کسی نے کسی کی بھلائی کی اچھی بات کہی تو فوراً دل پر قبول کر لیا کیونکہ اس سے پہلے ہی محبت ہے اور تعلق ہے۔ یہ نظام جو ہے اذن کا یہ مثبت اور منفی دونوں صورتوں میں انسانی زندگی میں جاری ہے۔

تو بعض لوگ اذن سیئہ ہوتے ہیں اذن خیر کی بجائے۔ یعنی برائی کے کان ہو جاتے ہیں اور بھلائی کے کان نہیں رہتے۔ ایسے لوگوں کو پھر جتنی بھی آپ برائیاں پہنچائیں گے وہ قبول کرتے چلے جائیں گے یہاں تک کہ برائی کی بات سننا ان کا چسکا بن جاتا ہے اور اس عادت نے محض نظام پر بعض دفعہ برے اثر نہیں ڈالے بلکہ اکثر گھروں کے امن کی تباہی کی یہی وجہ بنتی ہے۔ اگر گھر کے بڑے، خاوند یا بیوی یا ساس یا سسر یا ماں باپ جس حیثیت سے بھی آپ ان کو دیکھیں ان کے اندر یہ عادت ہو کہ برائی سنیں اور اسے قبول کریں اور اسے قبول کرنے میں لطف اٹھائیں اور یہ سمجھیں کہ اب ہمیں فلاں کے خلاف ایک بات ہاتھ آ گئی ہے۔ یہ جو ہاتھ آنے والا مسئلہ ہے اور یہ مزہ کہ

ہمیں پتہ لگ گیا ہے کہ فلاں میں کیا برائی ہے یہی انسانی زندگی میں ایک تباہی مچا دیتی ہے انسانی زندگی کا امن لوٹ لیتی ہے۔ مگر نظام جماعت میں تو اگر داخل ہوگی تو اس کے بہت ہی بد اثر پیدا ہوں گے اور دیر تک، دور تک اس کے اثرات جائیں گے۔ اس لئے ہم نے اگر نظام جماعت کی حفاظت کرنی ہے تو ان باتوں کا خیال رکھنا ہوگا۔

کسی امیر کو زیب نہیں دیتا کہ وہ چند لوگوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن جائیں یا چند لوگوں کے گھیرے میں اس طرح دکھائی دے کہ دوسری باقی جماعتوں پر یہ تاثر ہو کہ یہ ہم سے الگ ہو گیا ہے اور ان کی باتیں سنتا ہے۔ ایسی صورت میں پھر میرا تجربہ ہے کہ لوگ پھر امیر کو نہیں ان لوگوں کو باتیں سناتے ہیں اور ان سے تعلقات بڑھاتے ہیں ان کی خدمت میں تحائف پیش کرتے ہیں اپنی جہالت کی وجہ سے کہ اس کو خوش رکھیں گے تو ہماری باتیں ہوگی۔ تو تقویٰ کہاں باقی رہا؟ تقویٰ تو خدا کو خوش کرنے کا نام ہے اور ایسی صورت میں فیصلے سارے ہی غلط ہوتے ہیں اور اس مزاج کے لوگ اگر امیر کو براہ راست خوش کرنے کی کوشش کریں گے وہ بھی تقویٰ سے خالی بات ہوگی کیونکہ ان کو پتا نہیں کہ امیر کا مزاج اور خدا کا مزاج ہم آہنگ ہیں۔ اگر ہم آہنگ ہوں تو کوئی خطرہ نہیں لیکن اگر امیر کے مزاج پر ان کی نظر ہے اور وہ صحیح جانتے بھی نہیں کہ امیر کا مزاج ہے کیسا تو اس مزاج کو دیکھ کر فیصلے کرتے ہیں بسا اوقات وہ اللہ کی رضا کے خلاف ہوتے ہیں اور امیر کو خوش کرنے کی خاطر خدا کو ناراض اور بعض دفعہ امیر کو بھی ناراض کرتے ہیں کیونکہ امیر کا مزاج غلط سمجھے ہوتے ہیں۔ اپنی ٹیڑھی سوچ کو ایک بچارے امیر کی طرف منسوب کر دیا اور پھر اس سوچ کی خدمت کرتے ہوئے، اس کی مطابعت کرتے ہوئے غلط کام کر بیٹھے اور جب ناراضگی ہوئی تو پھر ان کے لئے اور مصیبت اور ٹھوکر کا موجب۔

تو یہ جو میں عمومی حوالے دے رہا ہوں یہ فرضی باتیں نہیں ہیں بلکہ جو بات بھی میں کہہ رہا ہوں اس کے پیچھے ایک تاریخ ہے۔ میرے سامنے لمبے ذاتی تجارب ہیں اور ہر بات کے پیچھے ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ اس کی تفصیل بیان کرنا ممکن نہیں۔ اپنی بات میں نے ذاتی تجربے کے طور پر تو بیان کر دی مگر اب سب کا حال کھولنا اس لئے بھی مناسب نہیں کہ بعض باتیں جب میں بیان کروں گا تو آپ میں سے بعض جماعتوں کے لوگوں کو پتا چل جائے گا کہ یہ فلاں کے متعلق بات ہو رہی ہے، یہ فلاں کے متعلق بات ہو رہی ہے۔ پھر اور بھی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ مگر تقویٰ کو فوقیت دیں اور امیر

کا یہ فرض ہے کہ ایسے تاثرات کو اپنے سے زائل کرنے کی کوشش کرے اگر اس میں کچھ بھی جواز ہے اور اگر جواز نہیں ہے تو پھر بھی ظالم لوگ تو ایسی باتیں کرتے ہی رہتے ہیں پھر اس کا فرض ہے مستغنی ہو جائے اور یہ ایک دوسری صفت ہے جو امیر میں ہونی ضروری ہے جو حضرت رسول اللہ ﷺ میں تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس صفت کو بڑے پیار کے ساتھ نہ صرف قبول فرمایا بلکہ اسے فروغ دینے کے لئے قرآن کریم میں آپ کے اس مزاج کو صادر فرما دیا۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ پر جو بہت ظالمانہ بہتان لگا ہے۔ اس بہتان کے تعلق میں سب سے زیادہ صدمہ تو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو تھا لیکن آپؐ نے اس ذاتی صدمے کی وجہ سے ان ظالموں سے خیر کے سلوک کو بند نہیں کیا، نہ پسند کیا۔ یہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ کے متعلق روایت ہے آپؓ نے بعض ایسے لوگوں سے جو اس ظلم میں بالواسطہ شریک ہو گئے تھے احسان کا سلوک بند کر دیا، جو خدمت کیا کرتے تھے ان کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے اس سے ہاتھ روکا تو قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ انسانی ضرورتیں اور محتاجیاں الگ مسئلہ ہے۔ اس وجہ سے ایسا فعل نہ کرو۔ تو دیکھیں قرآنی تعلیم سنت محمدیہ ﷺ میں ڈھل کر کیسے عظیم نمونے پیدا کر رہی ہے جن کی کوئی تصویر سارے جہان میں نیکوں کے اندر بھی دکھائی نہیں دیتی۔ بہت باریک لطائف ہیں جو محمد رسول اللہ ﷺ کے اعلیٰ کردار کی باتیں، جو نظام جماعت سے تعلق رکھنے والی باتیں ہیں صرف ان پر میں کہتا ہوں اگر نظر رکھیں تو آپ حیران رہ جائیں گے۔

خدا تعالیٰ بار بار بیان فرما رہا ہے کہ فلاں شخص منافق ہے، دھوکے باز ہے، قسمیں کھاتا ہے تجھ پر ایمان لایا مگر نہیں لایا۔ مگر اس کے باوجود آنحضرت ﷺ اپنے روزمرّہ کے کردار میں اور اپنے نظام کے فرائض کی ادائیگی کے تعلق میں ان سے قطعاً ادنیٰ بھی ناانصافی کا سلوک نہیں کرتے۔ یہ خدا نے راز کی بات بتائی ہے۔ یہ اللہ کی مرضی ہے جس پر جس کا عیب چاہے کھول دے۔ مگر جہاں تک دنیا کے تقاضے ہیں اس علم کے باوجود آنحضرت ﷺ جانتے تھے کہ جب تک انصاف کے پورے تقاضے انسانی سطح پر پورے نہ ہوں کوئی قانونی ردعمل دکھانے کا حق نہیں ہے۔ کچھ مزاج ہی ایسا تھا مگر مزاج کے علاوہ بھی عدل کے اعلیٰ مضامین کو اور اعلیٰ اصولوں کو جس باریکی سے آنحضرت ﷺ سمجھتے تھے دنیا میں کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ پس اس پہلو سے آپ کا جو نمونہ ہے وہ یہاں بھی تو جاری ہونا چاہئے۔

اب بعض لوگ امیر کے متعلق بعض باتیں کہتے ہیں اور وہ اُس تک پہنچ جاتی ہیں۔ اِس کے متعلق پہلا ردعمل تو یہ ہونا چاہئے کہ اگر اس نے واقعی سنجیدگی سے بات کو لینا ہے تو فرض ہے کہ وہ تحقیق کرائے اور پوری تحقیق انصاف سے کروائے۔ اس وقت تک جب تک تحقیق نہ ہو ایسے شخص سے اپنے تعلقات میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی پیدا نہ کرے اور اگر تحقیق کروالے تو پھر یہ دیکھے کہ کس حد تک اس میں عفو کا حوصلہ ہے، مغفرت کا حوصلہ ہے اور یہ دیکھے کہ کس حد تک عفو اور مغفرت ان کی اصلاح کا موجب بن سکتے ہیں۔ تو پھر اپنے عفو اور مغفرت کی جھولی میں ہاتھ ڈالے اور ان سے وہ احسان کا سلوک کرے جو ان کی اصلاح کا موجب ہوسکتا ہے۔ اس طرح جو بگڑے تگڑے جیسے کہتے ہیں محاورے میں، بگڑے تگڑے لوگ جو ہیں وہ بھی ٹھیک ہونے لگتے ہیں اور دن بدن سرکشوں اور بدوں کے دائرے تنگ ہونے لگتے ہیں اور یہ نہ ہو تو پھر ان کے دائرے رفتہ رفتہ بڑھنے لگ جاتے ہیں۔

اور یہی ہے جو مجھے فکر لاحق ہے کہ امارت کے حقوق ادا کرنے کی طرف تو میں نے جماعت کو توجہ دلائی اگر امیر کو اپنے حقوق ادا کرنے کی طرف تفصیل سے توجہ نہ دلائی تو جماعت میرے تعلق میں اس اعلیٰ تقویٰ پر قائم ہو تو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے فرمان اور قرآن کے فرمان کے پیش نظر عمل درآمد کرے گی بھی تو اس میں جان نہیں ہوگی۔ سچی جان پڑ ہی نہیں سکتی اور پھر اس حالت کو کوئی بقا نصیب نہیں ہوسکتی۔ کوئی ایسا وقت آسکتا ہے بیماری کا جیسے موسم بدلیں تو بعض بیماریاں سر اٹھا لیتی ہیں۔ کوئی ایسے حادثے پیش ہوسکتے ہیں ایسی جماعتوں میں کہ جہاں دبی ہوئی ناانصافی کے احساس اس وقت سر اٹھا لیں اور ایک باغیانہ رجحان پیدا ہو جائے۔ تو بعض کمزوریاں ایسی ہیں جن کے بیج بعض دفعہ باقی رہتے ہیں اور بیج ان کے کلیتہً مٹائے جا ہی نہیں سکتے۔ اصل میں صرف دیکھنا یہ ہے کہ بیج نشو ونما پا کر بڑھ رہے ہیں اور پھیل رہے ہیں یا پھیلے ہوئے سکڑنے لگ گئے ہیں اور رفتہ رفتہ اپنے تنے تک آ گئے اور تنے سے بھی ٹوٹ کر، مرجھا کر پھر وہ جڑوں تک پہنچ گئے ہیں اور جڑیں بھی پھر مرجھانے لگیں۔ یہ دو ہی رجحان ہمیں قدرت میں ملتے ہیں۔ اب دیکھیں بعض موسموں میں بعض درخت کس طرح زور کے ساتھ پتے نکالتے اور نشو ونما پاتے ہیں۔ وہ جو دور ہٹے ہوتے ہیں راستوں کے کناروں پر رفتہ رفتہ راستوں پر قبضہ کرنے لگتے ہیں یہاں تک کہ کھلے راستوں سے بھی گزرنا مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ ان کی شاخیں ہر طرف سے آ کر خالی جگہوں پر قابض ہو جاتی ہیں اور جب ان

پر بُرے دور آتے ہیں تو وہ سکڑنے لگتے ہیں، ان کی شاخیں ہٹتی ہیں پھر ٹوٹنے لگتی ہیں یہاں تک کہ وہ اپنی اصل جگہ پر پہنچیں تو سڑک ساری کھلی کھلی صاف دکھائی دینے لگتی ہے۔ تو اسی طرح جماعتوں میں منافقوں کا حال ہے اور بدکاروں کا حال ہے۔ باغیوں کا حال ہے۔ وہ فضا ان کے لئے پیدا نہ کریں کہ ان کی شاخیں آگے بڑھیں اور صراط مستقیم پر قبضے کرنے لگیں۔ اگر آپ نے توجہ نہ کی تو یہ خطرہ ہے کہ ایسا ہو جائے گا۔ ان کے لئے وہ ماحول رکھیں کہ ان کو صراط مستقیم میں داخل ہو کر راہروؤں کے لئے مشکل پیدا کرنے کا وہم و گمان بھی باقی نہ رہے۔ بیماریاں پالے ہوئے بیٹھے ہیں تو بیٹھے رہیں، اپنے دلوں میں سکیڑے رہیں۔ مگر امارت کا اور نظام جماعت کا یہ کام ہے کہ ان کی بیماریوں کی نشوونما کے حق میں کوئی فضا پیدا نہ ہونے دیں۔

جو امیر ان فرائض کو اس طرح سمجھ کر اپنی جماعت کی عمومی صحت پر نظر رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ وہاں یہ مریض سکڑنے لگتے ہیں، ان کے اردگرد بیٹھنے والے کم ہونے لگتے ہیں، ان کی مجلسیں اجاڑ ہونے لگتی ہیں یہاں تک کہ بعض دفعہ وہ اکیلے اکیلے رہ جاتے ہیں یا دو تین ساتھ کے اور ان سے لوگ خود ہی تعلق توڑ لیتے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم تنہا چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ بے چین ہوں گے تو اپنی جگہ ہوتے رہیں مگر جماعت کی صحت پر وہ کبھی بد اثر پیدا نہیں کر سکتے۔ اب اپنے تجربے سے آپ جن جن جماعتوں کو، جن جن حالات کو جانتے ہیں اس مضمون کو سمجھنے کی کوشش کریں اور نظر دوڑائیں تو آپ کو سب کچھ دکھائی دینے لگ جائے گا کہ ہر جگہ یہی ہوتا رہتا ہے۔ بعض جگہ بیماریوں کے اڈے بڑے ہو جاتے ہیں۔ لگتا ہے ایک عام فتنہ آ گیا، ایک زلزلہ برپا ہو گیا، اس طرح لوگ تباہ ہو جائیں گے۔ بعض دفعہ اس کا برعکس منظر ہے۔

لیکن یہ مضمون چونکہ لمبا ہے ابھی۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں وقت ہو گیا ہے۔ سر دست یہاں اس کو ختم کرتا ہوں۔ پرائیویٹ سیکرٹری صاحب نوٹ کر لیں جہاں سے بات ختم کی تھی تا کہ پھر آئندہ خطبے میں انشاء اللہ تعالیٰ اسی مضمون کو آگے بڑھاؤں گا۔ مگر آئندہ خطبہ یہاں نہیں دیا جائے گا وہ کسی اور ملک میں ہوگا اور ہم کوشش کر رہے ہیں کہ براہ راست وہاں سے یہاں آپ اسے سن سکیں اور اس طرح اللہ تعالیٰ توفیق بخشے گا تو جن کے پاس یہ ڈش انٹینا نہیں ہیں وہاں جماعتوں کو چاہئے ان کے لئے انتظام کریں کہ جماعتی مراکز میں اکٹھے ہو کر وہ اس خطبہ کو براہ راست سن سکیں۔ باقی آخر پہ دعا

کی درخواست ہے۔ دعا کریں اللہ تعالیٰ یہ سفر ہر پہلو سے، ہر لحاظ سے اپنوں اور دوسروں سب کے لئے مبارک فرمائے۔ آمین